راجہ گدھ

بانو قدسیہ

یہ تیسرے پیریڈ کا واقعہ ہے

ایم اے کی ساری کلاس حاضر تھی۔لڑکیاں ہم سے اگلی قطار میں بیٹھی تھیں۔۔۔ ۔ان چولستانی ہرنیوں میں وہ سب سے آخری تھی۔۔۔۔اکتوبر کا دن تھا جس طرح بھٹی سے نکل کر مکئی کے دانے سفید پھولے ہوئے بڑے اور ٹھنڈے نظر آتے ہیں ایسے ہی اکتوبر کا یہ دن تھا، بڑا پھولا ہوا اور سفید۔۔۔اس سے پہلے کے تمام دن بھٹی دیدہ گرم تھے۔لیکن یہ دن سفید سفید دھوپ میں کچھ پھولا پھولا بڑا بڑا نظر آتا تھا۔ کچھ دنوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ گھڑیوں کے تابع نہیں رہتے اپنی گنجائش اور سمائی کے مطابق گزرتے ہیں

پروفیسر سہیل نے نئی کار جیسی اس لڑکی کی طرف نظریں اٹھا کر سوال کیا۔''اپنا تعارف کرائیے!''

داخلے کے دن سے لے کر اب تک ہم اس کے نام کے متعلق کئی قیافے لگا چکے تھے۔چولستانی ہرنی اٹھی اس نے کرسی پر ایسے بازو رکھا جیسے موٹر سائیکل کے سہارے کھڑی ہو۔

''سر میرا نام سیمی شاہ ہے، میں نے کنیرڈ کالج سے بی اے کیا ہے اور میرے سبجکٹ سائیکلوجی اور ہسٹری تھے۔''

پہلی مرتبہ تمام طلبہ اپنے آپ کو باقی کلاس سے باضابطہ طور پر متعارف کرا رہے تھے، اس سے پہلے فرزانہ، انجیلا، طیبہ اور کوثر تعارف کر چکی تھیں۔لیکن یہ تمام لڑکیاں چہرے مہرے اور لباس سے اسی لگتی تھیں، جنہوں نے اخباری کاغذوں پر چھپے ہوئے نوٹس رٹ رٹ کر بی اے کیا ہو۔کوثر کے علاوہ ان لڑکیوں کی جنرل نالج اور علمی استعداد کورس کی کتابوں تک محدود تھی۔

کوثر حبیب اور سیمی شاہ ہماری کلاس کی آنکھیں تھیں۔جگمگاتی روشن۔۔۔دعوت

سے بھری ہوئی۔لیکن کوثر حبیب متاثر کرنے سے پہلے بیک گیئر لگاتی تھی۔ پسپا کرنے سے پہلے خود ہار جانے کی عادی تھی۔اس کے جسم اور ذہن کی بناوٹ ہی ایسی تھی، جیسے بہت خوبصورت بلب روشن ہو،لیکن بار بار بجلی کا فیوز اڑ جانے کی وجہ سے روشنی میں تواتر نہ رہے

اور سیمی شاہ؟۔۔۔۔

وہ گلبرگی معاشرے کی پیداوار تھی۔اس وقت اس نے موری بند جینز کے اوپر وائل کا سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں حمائل مالا نما لاکٹ ناف کو چھو رہا ہے۔ کندھے پر لٹکنے والے کینوس کے تھیلے میں غالباً نقدی، لپ سٹک، ٹشو پیپر تھے۔ایک ایسی ڈائری تھی، جس میں کئی فون نمبر اور برتھ ڈے کے دن درج تھے ایک دو ایسے قیمتی پن بھی شاید موجود ہوں گے جن میں سیاہی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بال پوائنٹ مانگ کر لکھا کرتی تھی اس کے سیاہ بالوں پر سرخ رنگ غالب تھا۔اکتوبر کے سفید دن کی روشنی میں اس کے بال آگ پکڑنے ہی والے تھے۔وہ بالکل میرے سامنے تھی اور اگر میں چاہتا تو اس کے کندھوں پر سلیقے سے جمے ہوئے بالوں کو چھو سکتا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس کے کرتے کے نیچے سے اس کی باڈس کا الاسٹک، ہک اور اوپر جانے والی طنابوں کو دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا۔

بھری پستول سے کبھی میں اس طرح خائف نہیں ہوا۔

لڑکوں کی قطار میں پہلا لڑکا آفتاب تھا

جب سیمی شاہ اپنا تعارف کروا چکی تو آفتاب اٹھا، امریکی فلموں کا چڑھتا سورج آہستہ آہستہ۔۔۔۔موسیقی اور لے کے ساتھ۔۔۔۔روشن کرتا ہوا۔۔۔۔گرمی پھیلاتا ہوا۔۔۔۔اس سکس ملین ڈالر مین نے بھاری آواز میں کہا۔۔۔۔"میرا نام آفتاب بٹ ہے سر۔میں اس کالج کا ہی اولڈ سٹوڈنٹ ہوں آپ مجھے خوب جانتے ہیں سر۔"

پروفیسر سہیل نے اپنی آنکھوں پر سے چشمہ اتار کر کہا۔۔۔۔"لیکن تمہارے ہم جماعت شاید تمہیں نہیں جانتے۔"

آفتاب نے پہلے لڑکیوں کی قطار پر کرنیں ڈالیں پھر ڈسکس پھینکنے والوں کی طرح تھوڑا پاؤں پر گھوما اور لڑکوں کو مخاطب کر کے بولا۔۔۔"پچھلے سال میں یونین کا صدر تھا بی اے میں میرے سبجکٹ سائیکالوجی اور سوشیالوجی تھے۔ میں اگر خود پسندی اور فلموں کا شوقین نہ ہوتا تو شاید بی اے میں ٹاپ کرتا۔لیکن مجھے فسٹ نہ آنے کا کچھ خاص افسوس بھی نہیں ہوا کیونکہ جو لڑکی پنجاب میں فسٹ آئی ہے وہ مجھ سے نوٹس لے کر پڑھتی رہی ہے ویسے میری Reputation والدین کے خوف سے اور اللہ کے فضل سے اچھی ہے۔"

ساری کلاس ہنس دی۔لڑکوں میں سے کسی دل جلے نے نعرہ لگایا۔"میاں مٹھو میاں مٹھو۔۔۔۔"

تعارف جاری رہا۔۔۔۔

پانچ لڑکوں اور پندرہ لڑکے جب تعارف کروا چکے تو فضا حالات زندگی اور ناموں سے بوجھل ہو چکی تھی۔شاید اس کے بعد کلاس ختم ہو جاتی اور جمائیاں شروع ہوتیں لیکن اس کے بعد ڈاکٹر سہیل نے میز پر سے چاک اٹھایا۔بلیک بورڈ پر ایک بڑا سا سر بڑی بڑی مونچھیں چھوٹے دھڑ اور بڑے بڑے بوٹوں والا ایک کامک فگر بنایا۔پھر اس کی آنکھوں پر چوکور فریم کی عینک پہنائی۔فریاد کے انداز میں پھیلے ہوئے بازو کھینچے۔۔۔۔اور نیچے لکھا۔

"اٹ ازمی۔۔۔۔ڈاکٹر سہیل۔۔۔۔میں آپ کو شاید سوشیالوجی پڑھاؤں گا۔"

بلیک بورڈ پر تصویر بنانے والا پروفیسر ہم سے بمشکل پانچ چھ سال بڑا تھا لیکن کہیں اس کے پاس ایک ایسا ہنٹر موجود تھا جو شیروں کو سدھارنے والے استعمال کرتے

ہیں اسے کبھی کورس پڑھانا نہ آیا۔لیکن وہ ذہنوں کا جوڑ کھیلنا جانتا تھا۔نظریات کی کشتی کرانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔اپنے شاگردوں کی کھوپڑیاں کھولنا اور خالی پا کر انہیں جوں کی توں بند کر دینا اسے جی سے پسند تھا۔الی ہوئی زبانیں آزاد کرا کے طوطے کی طرح باتیں کرانا اور ریڈیو کی مسلسل زبان بولنے والوں کو چپ کرانے کا فن بھی صرف اسے آتا تھا خوب آزادی برتتا اور ہر طرح کی آزادی دیتا۔کوئی بات کبھی اسے شاک نہ کر سکی سوشیالوجی کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کا ہر سبجکٹ آتا تھا۔سی لیے اس کی موجودگی میں فضا تعلیمی تضع سے ہمیشہ پاک رہتی اور طالب علم ایک دوسرے کی تشخص میں زیادہ غلطیاں نہ کرتے۔

پروفیسر سہیل نے اپنی گدی پر دایاں ہاتھ رکھا اور میز پر ذرا سا چونتر اجما کر بولا۔"میں عمر اور تجربے میں آپ لوگوں سے بہت بڑا نہیں ہوں لیکن چونکہ میری شادی نہیں ہوئی اس لیے مجھے پیار کرنے کے لیے صرف کتابیں ملی ہیں۔ابھی تک میرا Passion کتابیں ہیں۔کلاس میں کبھی کبھی آپ لوگ کچھ ایسے سوال کریں گے جن کا جواب مجھے نہیں آتا ہوگا۔اور میں بدقسمتی سے اتنا متکبر ہوں کہ سب کچھ برداشت کرتا ہوں کسی اور کی علمی برتری برداشت نہیں کر سکتا اس لیے I warn you جب تک آپ میری کلاس میں رہیں ہمیشہ مجھے گرو سمجھیں۔میرے علم کو زیادہ مانیں کبھی کبھی یہ بالکل Shallow ہوگا آپ خود بات کی تہہ کو بہتر سمجھتے ہوں گے لیکن مجھے اس بات کا احساس دلا کر آپ کو نقصان ہوگا۔میری چھاتی چھوٹی ہو جائے گی میں اپنی Whishkers منوا دوں گا اور میری بلٹ ڈھیلی ہو جائے گی۔کون کون چاہتا ہے کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہو جاؤں ہاتھ اٹھائیے۔۔۔۔"سوائے آفتاب کے کسی نے ہاتھ نہ اٹھایا۔

"بھلا کیوں مسٹر آفتاب آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔"

''سر اس لیے کہ آپ پہلے سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔صرف ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

قہقہوں میں سب سے اونچا قہقہہ پروفیسر سہیل کا تھا۔

اب کمرے میں تثلیث بن گئی لڑکیوں کی قطار کے آخر میں سیمی شاہ لڑکوں کی ٹکڑی کے سرے پر آفتاب بٹ ۔۔۔۔اور ان دونوں کے نقطۂ اتصال پر پروفیسر سہیل ۔۔ ۔گفتگو ان تینوں کے درمیان جاندار سرکٹ کی طرح چلنے لگی۔

ہنسی کے ختم ہونے پر پروفیسر سہیل پھر گویا ہوا۔۔۔''میرے پاس فی الحال موٹر سائیکل ہے کسی لڑکے کو ضروری کام ہو تو وہ مجھ سے چابی مانگ سکتا ہے۔لیکن جو وعدے کے مطابق موٹر سائیکل واپس نہیں کرے گا وہ دوبارہ اپنے اس حق کو استعمال نہیں کر سکتا اگر کوئی لڑکی بس سٹاپ پر کھڑی ہو اور ہاتھ دے کر مجھے روکے میں سے لفٹ دوں گا لیکن اگر وہ مجھے موٹر سائیکل موڑنے کو کہے گی تو میں اسے اتار دوں گا۔ ۔۔۔اب آپ سب مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس کیا کچھ ہے؟۔۔۔۔جو آپ دوسروں کے ساتھ Share کر سکتے ہیں اور کس حد تک۔۔۔۔''

''پن۔۔۔۔''ایک طرف سے آواز آئی۔

''سائیکل۔۔۔کبھی کبھی۔۔۔۔۔''

''ٹشو پیپر۔۔۔۔ہمیشہ''

''نوٹس۔۔۔۔امتحان کے بعد۔۔۔۔''

''لپ سٹک۔۔۔۔۔''سیمی شاہ بولی۔

''فلائنگ کس۔۔۔۔۔''آفتاب نے جواب دیا۔

''گڈ ویری گڈ۔۔۔۔مجھے پتا چلا کہ ہماری کلاس سوشیالوجی کی کلاس کا جی این پ کافی ہے اور ہم اس اعتماد کر کے آسانی سے آگے چل سکتے ہیں۔بائی دی وے کیا آپ لوگ کچھ سمجھتے ہیں فرد اور معاشرے کا آپس میں یا رشتہ ہے؟ فرد کی آواز بڑی

ضروری چیز ہے۔۔۔۔لیکن کیا کبھی یہ بھی ممکن ہوگا کہ معاشرہ بھی اپنی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائی اور پھر بھی قائم رہے۔۔۔۔؟"

اب پروفیسر کی شکل بوڑھی ہوگئی۔۔۔اپنے موٹر سائیکل جتنی پرانی۔۔۔۔

ہمیں معلوم بھی نہ ہوسکا کہ لیکچر شروع ہوگیا ہے۔

پروفیسر سہیل بڑی چابک دستی سے فرد اور معاشرے کے باہمی ربط کو زیر بحث لا رہا تھا۔لیکن کچھ ایسے باری باری گیند ہم سب کے کورٹ میں پہنچتا کہ ہم اپنی پوری ذہنی قوت کے ساتھ اسے پروفیسر کے کورٹ میں لوٹا دیتے۔دیکھتے دیکھتے چہرے تمتمانے لگے۔آوازیں تیکھی ہوگئیں۔ہاتھ ہوا میں چلنے لگے۔لڑکیاں جو نمازیں نیت کر بیٹھیں ہوئی تھیں سوئے کے ساتھ برف توڑتی نظر آنے لگیں۔بات فرد اور معاشرے سے ہو کر اب دور جا نکلی تھی۔اور ہم سویڈن تھائی لینڈ، روڈیشیا، میکسیکو، یوگینڈا کے مختلف معاشروں کا تقابل کرتے کرتے کبھی فرد کی محرومی کے متعلق سوچ رہے تھے اور کبھی معاشرے کی بے چارگی پر افسوس کر رہے تھے۔

پھر سیمی شاہ اٹھی اور بولی۔۔۔۔"سر آپ کا کیا خیال ہے اگر معاشرہ Ideal ہو تو کیا کوئی فرد کبھی خودکشی کر سکتا ہے؟"

پروفیسر نے اپنے چھتے کیسے سر میں انگلیاں ڈبوئیں پھر سوال کو لڑکوں کی قطار میں پھینک دیا۔لڑکوں کی قطار سے جب کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو پروفیسر نے کہا" دراصل خودکشی ایک Symptom ہے کسی معاشرے کے اندر اگر کوئی بیرومیٹر فٹ کیا جائے تو خودکشی اس کا آخری درجہ حرارت ہوگا۔افسوس مس شاہ ابھی کوئی آدرشی سوسائٹی ایسی نہیں بن سکی اس لیے ہم تجربہ نہیں کر سکتے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کا پریشر پاگل پن کو جنم دیتا ہے اور پاگل پن ہی خودکشی کا باعث ہے۔"

اس کے بعد وہ ڈرخائم کے حوالے سے دیر تک بات کرتا رہا۔ہم سب ایسی عمر میں تھے جب خودکشی سے ایک روحانی اور رومانی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے ایسی

وجوہات کا جائزہ لیا گیا جن کی وجہ سے فرد خودکشی پر مائل ہوتا ہے۔ اقتصادی معاشرتی شخصی، ذاتی وجوہات ۔۔۔۔ بالآخر بار خودکشی سے کھسک کر داغی امراض اور پاگل پنکی طرف مڑ گئی۔ کیونکہ خودکشی نتیجہ تھی وجہ نہیں تھی۔ اصلی وجہ وہ دیوانہ پن تھا جس کی بنا پر انسان کئی احمقانہ اقدامات اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

انجیلا شروع سے آخر تک خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پروفیسر سہیل کے ساتھ ساتھ فرزانہ طبیہ اور کوثر بہت گرم جوشی سے بحث میں حصہ لے رہی تھیں۔ لیکن یہاں پر ان کی بولتی بند ہوگئی۔

سہیل پروفیسر بولا ۔۔۔۔ ''آپ لوگوں نے فرد اور معاشرے کی کشمکش کو بہت خوبی سے سمجھا ہے اور بہت سے صحیح نتیجے اخذ کیے ہیں۔ مس فرزانہ ٹھیک کہتی ہیں کہ معاشرے کا پھندا جب فرد کی گردن پر بہت تنگ ہونے لگتا ہے تو کبھی کبھی فرد موت سے پہلے خود اپنے فیصلے سے مرنا پڑتا ہے۔ کوثر نے خودکشی کی ان گنت وجوہات کو ایسے بیان کیا ہے کہ اس میں ایک نئی دریافت کی سی تازگی پیدا ہوگئی۔ لیکن اب میں آپ لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وجیں خودکشی کا فعل جسے آپ سب متفقہ طور پر پاگل پن پر ۔۔۔۔ وجہ پر نتیجے پر نہیں پاگل پن کی اصلی وجہ کیا ہے ۔۔۔ یاد رکھئے پاگل پن جس قدر ششدر کرنے والی حالت ہے اسی طرح پاگل پن پیدا کرنے کی وجہ کو بھی حیران کن ہونا چاہیے۔''

اب ہماری لڑکوں کی ٹیم اس بحث میں لنگوٹے کس کر داخل ہوئی۔

''پاگل پن کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک تو Functional وجہ ہوسکتی ہے سر کہ بچہ پیدائشی طور پر نامکمل ہو ۔۔۔ دوسری وجہ نفسیاتی ہوسکتی ہے۔''

''اور گہرا دیکھئے ان وجوہات کے علاوہ شاید کوئی اور وجہ بھی ہو۔''

اب تک آفتاب نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا۔ یہ کشمیری بچہ سفید رنگ کی پیکنگ میں برتھ ڈے گفٹ کی طرح سجا سجایا پڑا تھا۔ آفتاب کی یہ عادت بعد میں

ہمیں پتہ چلی کہ جہاں مسکراہٹ سے کال چل جاتا وہاں وہ ایک لفظ نہ ضائع کرتا۔ جہاں لفظ سے عندیہ پورا ہوجات وہاں وہ جملے کو استعمال نہ کرتا۔ جہاں مختصر بات کافی ہوتی وہاں وہ لمبی بحث میں نہ پڑتا۔ وہ عموماً پوائنٹس میں بات کرنے کا عادی تھا۔

انگلیوں پر گنتا جاتا ۔۔۔۔ایک ۔۔۔۔نمبر دو ۔۔۔۔نمبر تین ۔۔۔۔اور زیادہ وقت اسے نمبر تین سے آگے بڑھنے کی ضرروت نہ ہوتی۔ ایم اے کی کلاس میں آفتاب کی سب سے لمبی گفتگو تھی۔

آفتاب اٹھا اس نے اپنے دونوں بازو صلیب کی طرح اٹھائے آدھی آستین والی قمیض میں اس کے دونوں بازو سنہری گھاس سے اٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی اس کی براؤن آنکھوں میں چمکتے شہد جیسی روشنی پیدا کر رہی تھی اور اس وقت وہ اولمپک کھیلوں میں آگ مشعل اٹھانے والے کھلاڑی کی طرح خوبصورت، کنوارہ اور مقدس نظر آرہا تھا۔ شاید اسی لمحے سیمی نے اس کی طرف دیکھنے کی غلطی کی اور دیوانی ہوگئی۔

''پاگل پن ہمیشہ نا آسودہ آرزؤں سے پیدا ہوتا ہے سر ۔۔۔۔اور نا آسودہ آرزوئیں ان Taboos سے جنم لیتی ہیں۔ جو ہر کلچر میں موجود رہتی ہیں۔ جس کلچر میں ماموں زاد بہن سے شادی نہیں ہوسکتی وہاں ماموں زاد بہن کے عشق لاحاصل سے دیوانگی پیدا ہوسکتی ہے۔''

''فرائیڈ سے مستعار لینے کا شکریہ ۔۔۔۔سیمی نے قینچی جیسی تیکھی انگریزی میں کہا۔''

''محترمہ ۔۔۔۔پاگل پن کی یہ وجہ میں نے Repression سے نہیں لی ۔۔۔۔ میں جس پاگل پن کا ذکر کر رہا ہوں وہ میر تقی میر کا پاگل پن ہے ۔۔۔فرہاد کا پاگل پن ہے ۔۔۔پروفیسر سہیل تو دیوانے پن کی ایک سائیڈ دکھا رہے تھے خودکشی اور

موت میں دوسری سائیڈ پیش کر رہا ہو جہاں پہنچ کر دیوانہ پن مقدس ہو جاتا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لیتا ہے دودھ کی نہریں بہا دیتا ہے۔"

کسی لڑکے نے پیچھے سے نعرہ لگایا۔۔۔۔"بیٹھ جاؤ جناب فرہاد صاحب۔"

آفتاب نے پیچھے قہر کی نظر ڈالی اور بیٹھ گیا۔

"Thats a point" پروفیسر سہیل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"یعنی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاگل پن دو قسم کا ہے۔۔۔۔ایک مثبت ایک منفی۔۔۔۔ویری گڈ۔۔۔۔اب اس مہینے آپ سب کی یہ Assignment ہو گی کہ آپ مجھے ایک نہ ایک وجہ ایسی بتائیں جس سے فرد میں پاگل پن پیدا ہوتا ہے۔ ۔۔یہ وجہ جبلی نہیں ہونی چاہیئے۔Enviromental نہیں ہونی چاہیئے۔۔۔۔کوئی آفاقی نظریہ لیکن بالکل نئی وجہ ہونی چاہیئے میں سب سے زیادہ سے پھرے جواب پر سب سے زیادہ نمبر دوں گا۔"

کلاس میں شور مچ گیا۔

"سر دیوانے پن کی صرف ایک وجہ ہے ماحول۔۔۔۔ماحول۔۔۔۔ماحول" ایک طرف سے آواز آئی۔

"سر انسان میں پیدائشی نقص ہوتا ہے Biological"

"Repression سر۔۔۔۔"

"مانے نہ مانے کوئی۔۔۔۔اصلی پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔۔۔۔صرف ایک وجہ عشق لاحاصل۔۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔۔"

بھنگڑا ڈالنے کی انداز میں آفتاب کرسی پر چڑھ کر چلایا۔

"آڈر آڈر۔۔۔۔" پروفیسر سہیل نے کہا۔"دوستو میری Increment کا سوال ہے اگر تم لوگ ایسے شور مچاؤ گے تو کالج والے میری رپورٹ کر دیں گے۔ پرنسپل صاحب کے پاس۔۔۔۔اور میری تبدیلی مظفر گڑھ کر دیں گے۔"

اس کے بعد بحث بے پتوار کی کشتی بن کر چلنے لگی۔

کلاس کے کسی ہیں نوجوان نے گروپ شادی اور حشیش کا قصہ چھیڑ دیا۔ پھر مغرب کی آزاد روی سی بات نیگرو مسئلے کی طرف گئی۔ سویڈن میں ابے سینا کے رفیوجی مسائل، ریڈ انڈین اور ان کے جادوگروں کی باتیں تو نا آبادیات اور جمہوریت کے بکھیڑے جاپان اور اس کی انڈسٹریل کامیابی۔۔۔۔روس کا پلٹتا ہوا کمیونسٹ نظام، جو بھی بات کسی کو معلوم تھی اس نے کی۔۔۔۔لیکن سیمی شاہ کو کرسی پر کھڑے آفتاب کے عشق لاحاصل نے سر کرلیا۔ وہ گلبرگ کی ساختہ تھی۔ اس کی ساری عمر کونونٹ سکولوں اور کالجوں میں گزری تھی۔ اپنے خالی اوقات میں وہ انگریزی موسیقی سنتی، ٹائم اور نیوز ویک پڑھتی، ٹی وی پر امریکی سیریز دیکھتی اس کی واڈروب میں گنتی کے شلوار قمیض تھے، وہ شمپو ہیئر سپرے، ٹشو پیپر، کولون، اور سینٹ سپرے کے بل بوتے پر سنگار کرتی تھی۔ اس نے کبھی لوٹے بالٹی سے غسل نہ کیا تھا۔ بیک برش اور شاور سے نہانے والی اس دختر گلبرگ کو نہ جانے کیا ہوا کہ ایک کشمیری بچے سے وہ بھی اندرون شہر کے رہنے والے سے جب وہ عشق لاحاصل کا نعرہ لگا رہا تھا مات کھا گئی۔ اس سے پہلے سیمی شاہ اور آفتاب کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ ایڈمیشن فیس داخل کرواتے وقت برآمدے میں آتے جاتے۔ لیکن اس تیسرے پیریڈ میں ان دونوں کی نگاہوں میں پہلے استعجاب ابھرا۔ پھر پہچان پیدا ہوئی اور ایک ہی سیشن میں سب کچھ اعتراف میں بدل گیا۔ کلاس کے بعد وہ دونوں اٹھے ایک انجانی قوت کے تحت ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ باہر پہنچ کر سیمی شاہ کچھ کہے بغیر آفتاب کی موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ آفتاب نے سوال نہ کیا کہ اسے کہاں جانا ہے اور وہ دونوں کسی فلمی منظر کی طرح آہستہ آہستہ سڑک پر فیڈ آؤٹ کر گئے۔ تعارفی تقریب میں تین افراد نے میرا پڑا کیا۔

آفتاب جسم کے اعتبار کے بالکل یونانی تھا۔۔۔اگر وہ کلاس میں موجود نہ ہوتا تو

شاید میرا چراغ روشن سب سے روشن ہوتا، ایک خاص قسم کا بغض، حسد اور اللہ واسطے کا بیر میرے دل میں اس کے خلاف پیدا ہو گیا۔

دوسرا دھکا مجھے پروفیسر سہیل سے لگا اس سے پہلے کورس کی کتابوں سے نوٹ بنا کر رکھے ہوئے تھے ہر سال وہ ان ہی مختصر نا مچوں کے بل بوتے پر پڑھاتے آ رہے تھے۔ اور پنشن ملنے تک ان کی تعلیمی استعداد بڑھنے کے امکانات صفر تھے جو نظریات انہوں نے سروس کے شروع میں مرتب کیے۔ ان کو بدلا یا ان میں ترمیم کرنا ممکن نہ تھا۔

سکول میں ہم ماسٹر غالم رسول کی پرورش میں رہے۔ ان کی ڈاڑھی زبان کی گھن گرج اور وہ میز کبھی تبدیل نہ ہوئی جس پر وہ کلاس میں آتے ہی اپنی چھڑی رکھتے تھے۔ ان کی ڈاڑھی ہمیشہ کاسی مائل سیاہ خضاب سے چمکتی نظر آتی جس طرح تھانیدار ملزم کو لمبا ڈال کر ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں ایسے ہی وہ ہمیں بنچ پر کھڑے کر کے ہماری عزت افزائی کرتے تھے۔ ان کی آواز کا ولیوم ۔۔۔۔ کنٹرول خراب تھا اور صرف اونچے سروں پر کام کر سکتا تھا۔ گرمیاں سردیاں ان کی وہی بل دار سیاہ چھڑی میز پر نظر آتی۔ چھڑی تک ہماری رسائی نہ تھی۔ اس لیے ہم میز سے بدلے لیا کرتے تھے۔ پرکار سے گود گود کر نقطوں کی شکل میں اس کی چاروں ٹانگوں پر کئی گالیاں کندہ تھیں۔ لیکن یہ میز بدسلوکی کے باوجود اور ماسٹر صاحب کی ہمدردی بددعاؤں کے باوصف کبھی اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ اگر ان کے منہ سے نکل جاتا کہ جنگ آزادی ۱۶۴۷ء میں ہوتی تھی۔ تو پھر تمام کتابوں کی تصدیق کے باوجود اپنی رائے بدلنے پر رضامند نہ ہوتے، ان کی اس اٹل خاصیت کی وجہ سے ان کے تمام شاگردوں ڈرپوک گھنے اور بزرگ دشمن تھے۔ ماسٹر غلام رسول مغل بادشاہوں کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام شاہ ان کے ہیرو تھے۔ اگر ان کے عہد حکومت یا ذات میں کوئی کوتاہی کسی کو نظر

آتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔ نکتہ چینی کرنے والے کو دلائل دے کر قائل کرنے کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔ ایسے میں ان کا وولیم کنٹرل کھلتا جاتا اور وہ دلیل کی جگہ چنگھاڑ سے اگلے کو قائل کر لیتے۔

نویں جماعت کے شروع میں کہیں سے توزک جہانگیری میرے ہتھے چڑھ گئی۔ میں سارا دن ہم جماعت کو اس کے واقعات سناتا نہ تھکتا۔ گو میں ماسٹر غلام رسول کی ذہنیت سے واقف تھا لیکن نئی نئی جوانی چڑھی تھی انا پھن اٹھائے کھڑی تھی میں نے ہم جماعتوں پر اپنا رعب ڈالنے کے لیے ایک روز کلاس میں جرائت سے کہا۔ 'ماسٹر جی آپ نے توزک جہانگیری پڑھی ہے۔''

''جب تو ابھی تھوڑا تھوڑا موتتا پھرتا تھا۔ تن میں نے اس کو پڑھا تھا، بیٹھ جا اور زیادہ علمیت نہ بگھارا کر کلاس میں۔''

''ماسٹر جی۔۔۔۔''میں نے ذرا سی ارکوشش کے بعد کہا۔

''کیا ہے؟''

''اس میں کچھ ایسے واقعات درج ہیں جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ بادشاہ جہانگیر کچھ ایسا رحمدل نہیں تھا۔''

ماسٹر غلام رسول نے چاک کا ٹکڑا اڑیل میز پر مارا۔

''نور جہاں سے شادی کی۔۔۔۔ یہ رحم دلی نہیں؟ کوئی بادشاہ کسی دوہاجو سے شادی کرتا ہے؟ اس کو کمی تھی کنواریوں کی بول بتا رحمدلی نہیں تو اور کیا ہے۔ بتا؟''

ماسٹر جی اور میں مختلف پیمانوں سے رحم دلی کو ناپتے تھے۔

''جہانگیر نے ایک ملزم کو۔۔۔ ماسٹر جی بکرے کی کھال میں بند کروا کے اوپر ملزم تھا ناں کوئی بے گناہ تو نہیں تھا۔ سزا ہمیشہ بہتری کے لیے دی جاتی ہے اب میں تم کو مارتا ہوں تو کیا اس کا فائدہ مجھے ہوتا ہے بتاؤ۔۔۔۔ ساری سزا ملزم کے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔''

''لیکن ماسٹر جی جو بکری کی کھال میں سلوا دیا گیا اس کو کیا فائدہ ہوا؟''

''بیٹھ جا۔۔۔۔بیٹھ جا اور بخشی نہ جاتا کر اپنے بڑے بھائی مختار کی طرح۔۔۔۔ مطلب ہو نہ ہو بخشی چلا جا رہا ہے، بولے جا رہا ہے خیر سے مونچھیں آ جائیں سدھی پدی تو بات کریں گے جہانگیر اعظم کی۔''

وہ سکندر اعظم کی طرح ہر مغل بادشاہ کے ساتھ اعظم لگانے کے عادی تھے اپنی مونچھوں کے سلسلے میں میں پہلے ہی کچھ شرمسار رہتا تھا اس لیے میں چپ چاپ بیٹھ گیا لیکن علمیت بگھارنے والے کڑکے نے میرے اندر کہیں بغاوت کر دی۔

تعلیم و تدریس کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ عام استاد عموماً اوسط درجے کا شخص ہوتا ہے اور وہ ذہنی جسمانی اور جذباتی طور پر لکیر کے فقیر قسم کی باتیں سوچتا ہے اسے ضبط و نظم سے مڈل کلاس لوگوں سے، اور پڑھا کو طلبا کو پڑھانے سے پیار ہوتا ہے لیکن سارا دن وہ بڑی قد آور شخصیتوں اور ان کے کارناموں کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے کبھی معاشرے کے ساتھ مطابقت نہ کی۔ عام ترین ہوتے ہوئے وہ ایسے لوگوں کی تعلیم عام کرتا ہے جن کی سطح پر وہ سوچ بھی نہیں سکتا اس کا اپنا کردار بچوں کو عام بنانے پر مصر رہتا ہے اور اس کی تعلیم بچوں کو خاص ہونے پر اکساتی رہتی ہے۔ سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی جگہ سکول میں نہیں ہوتی لیکن ایسے ہی باغی بچوں کو بچ کر کھڑا کر کے ہمیشہ ان عظیم شخصیتوں کی روشن مثالیں دی جاتی ہیں جو خود سکولوں سے بھاگے تھے۔ ہر غلام رسول بچوں کو جنہیں جینیس۔۔۔۔ کی کتابیں پڑھا کر عام بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور یہی تعلیم کا سب سے بڑا المیہ ہے خاص لوگوں کی تعلیم اور عام لوگوں کی داد گیری میرے دل کی بنچ پر بھی ماسٹر غلام رسول کئی قد آور شخصیتیں کھڑی تھیں اس درخت جیسی ہو گئی جسے زیبائش کے لیے جاپان میں پالا جاتا ہے، جو سالوں پرانا ہوتا ہے لیکن جس کا قد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

میں اسی لیے اس قدر محتاط تھا کہ کبھی کبھی بے عمل ہو جاتا۔

تجزیے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن عملی زندگی میں بھی سیدھے راستوں کی بجائے میں پگڈنڈیوں پر آوارہ کتوں کی طرح سرگرداں رہتا۔ مجھے کسی ایسے گرد کی تلاش تھی، جو مجھے کھینچ تان کر اپنے علم جتنا بڑا کر دے لیکن سکول کے بعد ایک اور ماسٹر غلام رسول مل گئے۔

ان سے میری ملاقات بی اے کے پہلے سال مین ہوئی۔ پروفیسر تنویر ہمیشہ فارن سگریٹ پیتے ان کے تھری پیس سوٹ بے داغ ہوتے۔ چہرے پر موٹے شیشوں کی عینک ہوتی۔ کلاسوں کے علاوہ وہ ہمارا ٹوریل بھی لیتے تھے۔ انہوں نے بھی ان گنت کتابیں پڑی تھیں۔ ان کا مطالعہ مجھے مرعوب کرتا تھا۔ کیونکہ میری اولین تعلیم دیہاتی تھی۔ اس لیے میں فیوڈل نظام پسند کرتا تھا۔ وہ پکے سوشلسٹ تھے۔۔۔۔ تھوری کی حد تک وہ معاشرے کی ہر مسیبت کو دولت کی غلط بانٹ سے منسوب کتے۔ ۔۔۔بی اے کے پہلے سال میں وہ ایک اور قسم کے ماسٹر غلام رسول ہیں۔ وہ دل سے سوشلسٹ تھے۔ لیکن صرف کتابی طور پر۔۔۔۔ ان کا رہنا سہنا ملنا ملانا، زندگی بسر کرنے کی چھوٹی چھوٹی جزیات کسی فیوڈل لارڈ کیسی تھیں، مشکل یہ تھی۔ وہ نہ اپنے سوشلسٹ نظریئے پر تنقید برداشت کرتے تھے۔ نہ اپنی طرز زندگی پر۔

اگر کوئی تضاد ان کے شاگردوں کی نظر پڑ جاتا اور وہ اس پر رائے دے دیتے تو ماسٹر تنویر سختی کے ساتھ اس آزادی رائے کی سرکوبی کرتے جس کے وہ پرچارک تھے۔

بی اے فائنل کے امتحانوں سے کچھ دن پہلے کی بات ہے وہ میں کلاس میں سگریٹ پینے کی اجازت دے کر اپنے روشن خیال ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔

''میں کھڑا ہو کر بولا۔۔۔۔ سر ایک بات ہے۔''

''سگریٹ مت بجھاؤ ہم دوست ہیں پوچھو۔ اور بیٹھے رہو۔''

''سر آپ ہر روز ہمیں بتاتے ہیں کہ روپیہ تھرڈ ورلڈ ذلت کی جڑ ہے۔ پھر آپ اپنی کار بیچ کر معمولی موٹر سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے؟''

ابھی میں پختہ نہیں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ عام طور پر قول اور فعل کے تضاد سے بڑی قد آور شخصیتوں کا خمیر بنا ہوتا ہے۔

پروفیسر تنویر کا چہرہ لال ہو گیا۔ انہوں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا ''یہ بالکل پرسنل سوال ہے بیٹھ جاؤ اور یاد رکھو تم قصباتی لوگوں کے manners بہت کمزور ہوتے ہیں، بے وقوف گدھے۔۔۔۔ اگر میں کار بیچ دوں گا تو کالج کیسے آؤں گا؟۔''

میری انا کو سخت دھچکا لگا۔ اس لیے بحث کو اب چھوڑنا میرے لیے بھی آسان نہ تھا میں نے پروفیسر تنویر کو زچ کرنے کے لیے کہا۔۔۔۔ ''سنیکل پر سر۔۔۔۔ سائیکل پر۔۔۔۔ انسان کو عوام میں ملے رہنا چاہیئے۔''

''یہ Space age ہے گدھے آدمی۔۔۔ ہر کام میں وقت بچانا پڑتا ہے۔ اور ہم مجھے سائیکل سوار بنا رہے ہو۔''

''لیکن سر چین بھی تو Space age میں ہے وہاں کے لاگ۔۔۔۔''

''ایک دانشور انٹو یکچوئل سائیکل پر آئے جاتے۔۔۔۔ اور تمہارے بزنس کارخانے دار۔۔۔۔ دو کوڑی کے نو دولتیے کاروں پر گھومیں۔ مر مر کر تو جگہ ملی ہے معاشرے میں۔۔۔۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد گریڈ بڑھے ہیں۔ ہم بھی عزت وار زندگی بسر کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔''

''سر لیکن آپ کے نظریات کے مطابق تو سوسائٹی میں کوئی طبقہ نہیں ہونا چاہیئے، جس سے عزت بے عزتی کا سوال پیدا ہو۔''

اب پروفیسر کے منہ سے جھاگ اڑنے لگی وہ دونوں بازو لہرا لہرا کر بولے۔۔۔۔ ''بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔۔۔۔ مینڈکی! کھوپڑی ڈھائی ڈھائی انچ کی ہوتی ہے اور

اس میں مارکس کے نظریات بٹھانا چاہتے ہیں، بیٹھ جاؤ۔۔۔ بھائی میاں۔۔۔ پہلے ٹائی کی ناٹ باندھنا سیکھو۔۔۔ پھر ادھر آنا۔۔۔ ان باتوں کی طرف۔۔ ۔۔‘‘

میں اپنی ٹائی کی ناٹ ہتھیلی میں چھپا کر بیٹھ گیا۔۔۔ پروفیسر تنویر کو کھوپڑیاں کھولنے کا عمل نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کو ایسی تعلیم دینے کے اہل نہ تھے جو نظریے اور عمل کا فرق کم کر دے۔

لیکن پروفیسر سہیل ایسا چھپا ہو کاغذ نہیں تھا، جس پر مزید کچھ لکھا نہ جا سکے، وہ تو سلیٹ کی مانند تھا، لکھا۔۔۔ مٹایا اور پھر لکھ لیا کتابوں سے اس کا شغف دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔۔۔ مجھے بھی عرصے سے کتابوں کی رفاقت نصیب تھی۔ لیکن کتابوں نے مجھ سے زندگی کی ہلکی طرف کو پشیدہ کر دیا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا، کہ کتابوں نے مجھ سے زندگی کی ہلکی طرف کو پوشیدہ کر دیا تھا، میں محسوس کرتا تھا، کہ کتابوں سے محبت کرنے والے عموماً زندگی کی اس اہم سمت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ اس قدر سنجیدہ ہو جاتے ہیں کہ مزاح مکمل طور پر ان کی زندگی سے نکل جاتا ہے اور وہ لمبے جبے پہن کر سارا وقت پڑھے ہوئے نظریات کی لاٹھی سے دوسروں کی پٹائی میں مصروف رہتے ہیں۔

پروفیسر سہیل مختلف اور عجیب تھا شخصیت پر کسی نہ کسی غلام رسول نے اپنی مہر لگا رکھی تھی۔۔۔ اسلیے بچے کی طرح سادہ، کسی گنوار کی طرح متحیر اور کسی مسخرے جیسے ہنسوڑ پروفیسر سہیل کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ تعارفی کلاس میں ہی مجھے اپنی علم دوستی سے گلہ پیدا ہو گیا۔ مہاتما بدھ کی دھاما پادھا سے لے کر موجودہ دور کے تازہ ترین علم پیرا سائیکلوجی تک مجھے جو کچھ پیش آیا تھا۔ اس سے اکتاہٹ پیدا ہو گئی۔ کاش میں بھی سادہ سلیٹ ہوتا۔۔۔ پچھلا لکھا ہوا مٹا سکتا اور پروفیسر سہیل کی دی ہوئی Assignment کو اسی تازگی سے لکھ سکتا جس کی وہ ہم سے توقع رکھ رہے تھے۔

حالانکہ ابھی میں نے مضمون نہیں لکھا تھا۔لیکن ابھی سے انہین مایوس کرنے کا دکھ مجھے تھا۔

آفتاب کے حسن اور پروفیسر سہیل کے علم کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بعد میں نے تیسرا سجدہ سیمی شاہ کو کیا۔۔۔۔غالبًا اس میں اس کلچر کی جیت تھی جو دیہاتی لوگوں و میسر نہیں آتا۔

میں نے اس سے پہلے اتنی مکمل شہری لڑکی نہین دیکھی تھی۔اسے دیکھ کر میں اشتہاروں کی دنیا میں پہنچ گیا۔اور وہ مجھے ہوائی سفروں پر بادلوں سے اوپر لے گئی۔ اس کا لب ولہجہ۔لباس اٹھنا بیٹھنا،جسم سے اٹھنے والی خوشبو سب اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ مجھ سے زیادہ مہذب ہے۔اب میری انا کا یہی مسئلہ تھا کہ میں اس لڑکیکو پچھاڑوں۔اور اسے اپنیدیہاتی بیک گراؤنڈ میں گھسیٹ کر لے جاؤں جہاں وہ میری وجہ سے پچھاڑ کھا کر گرے اور مکمل طور پر دیہاتی ہو جائے۔

پھر اس کے صبح وشام ماں کی طرح لسی پینے دودھ دوہنے، چرغا کاتنے اور بڑی بڑی ہانڈیوں میں ساگ پکاتے ہوئے صرف ہوں۔شاید ہر مرد کے اندر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ عورت کو اس کی پٹڑی سے اتارے اور اپنے راستے پر لے کر چلے۔ اب یہ اور بات ہے کہ آفتاب مجھ سے پہلے ہی سیمی شاہ کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر رخصت ہو گیا تھا۔اور اندرون شہر کے کلچر پر اردو میں پہلا لیکچر دے رہا تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں

پوٹھوہار کا وہ علاقہ جہاں آج کل دوسرے درجے کے بے آب خاکستری پہاڑ ہیں اور جن کو مقامی لوگ پبتیاں پکارتے ہیں۔یہی علاقہ جو ہوائی جہاز کی کھڑکی سے امریکہ کے جنوبی ریگستانوں سے مشابہہ نظر آتا ہے یہ علاقہ ایک زمانے میں لہریں مارتا چاند کی طرف لپکا،مردیں سمندر تھا۔پھر کسی جوگی نے وتین صدی سے اس کے

کنارے بیٹھا گیان دھیان میں مصروف تھا۔ مندر کو نظروں سے اوجھل ہونے کا سراپ دے دیا۔ سمندر ایسے لوٹا کہ ہر ہر لہر پالا گن پالا گن کہتی بحیرہ عرب میں جا گری اور اس علاقے کی تہہ آب چھپی ہوئی پہاڑیاں ٹنڈ منڈ باہر نکل آئیں۔ ان پہاڑیوں کے نشیب و فراز اور کٹاؤ ایسے تھے کہ لہر در لہر سمندر کے بہاؤ کا پتہ دیتے تھے۔

کچھ اور لوگ کہتے ہیں اس علاقے سے لحق کبھی ایک گھنہ جنگل تھا۔ جنگل کے درخت ایسے اونچے چھتنارے ڈال ملے تھے کہ اس میں بہنے والی ندیوں کو بھی راستہ نہ ملتا اور سورج کی روشنی سے ان کے پانیوں میں کبھی ست رنگے بھنور نہ پڑتے۔ یہاں سارا دن پرندے آزادی سے گھومتے پھرتے اور الو بھی دن کے وقت دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ایک رات چاند سے ایسے آسیب کی ہوا اتری کہ سارا جنگل ٹنڈ منڈ ہو گیا اور سب ندی نالے سوکھ گئے۔ اسکے علاوہ کچھ لوگ کہتے ہیں کئی قرن پہلے جب پہلی بار بنی نوع انسان متحد ہوا تو یہ جنگل موجود تھا۔ اس وقت وہ تمام منذ اول علوم رائج تھے جو آج پھر سکھائے جاتے ہیں۔ تب پہلی بار انسان نے مریخ اور زہرہ کا سفر کیا تھا اور زمین پر ایٹم بن بنائے تھے۔ جب تمدن کی کمان پورے زور سے تن گئی تو انسان نے سارے بم گرا کر اللہ کی دھرتی کو تہس نہس کر دیا۔ اور یہ جنگل بے آب و گیاہ بنجر علاقہ بن گیا۔

یہ تب کا ذکر ہے جب انسان نے پہلی بار متمدن ہو کر اپنے بم دنیا پر نہ چلائے تھے۔ جانوروں کی بستیوں میں اس ایجاد کی وجہ سے بہت تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ اسی لیے جنگل میں کانفرنس بلائی گئی۔ جانوروں کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں اتنے پرندے آئے کہ جنگل کے درختوں کی کسی شاخ پر بیٹھنے کو جگہ باقی نہ رہی۔

ہند سندھ سے کاسنی پروں غول در غول آئے کھاسی کی پہاڑیوں سے سرخ دم والی بلبل اور فیروزی رنگ کا کبوتر اس شان سے آیا کہ اس کے اندرونی نارنجی پروں سے

سکی آنکھیں خیرہ ہوئیں کھٹ منڈو کا بھجنگا اور تبت کے شاہین کئی پڑاؤ ٹھر ٹھر کر حاضر ہوئے۔ افریقہ کے بھٹ تیتر بن مرغی اور بلبلیں تو آئی ہی تھیں لیکن شکاری پرندوں نے بھی اپنی مصروفیات بھلا کر امریکہ اور آسٹریلیا سے یہاں تک کا سفر اختیار کیا تھا۔ اونچے اونچے درختوں میں ریسٹ ہاؤس بن گئے شکرہ باز چرخ عقاب گوایشیا کو چک اور روسی ترکستان کے باسی تھے لیکن وہ بھی پامیر کے پرندوں کو ساتھ لے کر پہنچے تھے۔ کوا، مینا، بٹیر، کھٹکھٹ چکور، چڑیا، مقامی جنگل کے عوام تھے۔ اس لیے میٹنگ میں ان کی اجتماعی ووٹ بہت اہم تھی۔ لیکن انفرادی طور پر کوئی ان کی رائے کو نہ پوچھتا تھا۔ مڑی ہوئی ناک اور ارنجی اڑانوں والے پرندے سفید فام قوموں کی طرح احساس برتری سے اترئے پھر رہے تھے۔ دریائے گھاگرا اور چترنجی کے طاس سے لٹورے، بھوری کنڈول اور غوغائی بڑے طمطراق اور سلیقے سے فوجی ہوائی جہازوں جیسی فارمیشن بناتی آئیں۔ زریں پشت، نیل کنٹھ اور ہدہدوں کی ٹولیوں نے پرانے درختوں کے ٹھنٹھ بسرام کے لیے چن لیے۔ فاختہ کوئل اور چنڈول کو اس مجلس مشاورت سے کوئی دل چسپی نہ تھی ان کے بھانویں انسان چاہے۔ ساری کائنات ختم کر دیتا وہ میلے گھومنیاں تو جنگل والوں سے ملے ملانے چغلی عیب جوئی کے لیے آئی تھیں۔ لیکن جنگل میں پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ معاملہ سنگین ہے۔

کانفرنس سے کچھ دن پہلے سارے بن مین بھانت بھانت کے پرندوں سے کوک پڑی تھی۔ صاحب صدر کا سب انتظار کر رہے تھے۔ کرسی صدارت خالی ہونے کی وجہ سے کانفرنس جاری نہ کی جا سکتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد پرندوں کی نمائندہ ٹولی ماؤنٹ ایورسٹ سے یہ خبر لے کر واپس آئی کہ وہ تمام پربت چھان آئے ہیں۔ دھولی دھار نانگا پربت، کے ٹو اور کنچنجگا تک ہو آئے ہیں لیکن ہما کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ شاید دنیا میں کسی زبردست بادشاہ کی آمد تھی اور وہ اس کے انتخاب مین کائناتی طاقتوں کی مدد کرنے کے لیے اپنے وی آئی پی ٹور پر نکلا تھا۔ اس دور کے متعلق بھی